ید اللہ علی الجماعۃ
جمعیۃ علماء ہند
دہلی
جمہوریت
اپنے آئینہ
میں
از حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب
شائع کردہ
الجمعیۃ بک ڈپو۔ گلی قاسم جان۔ دلی ۶

بنو آدم اعضای یکدیگرند

جمہوریت اپنے آئینہ میں

اور

اسلامی نظامِ حکومت کا مختصر خاکہ

مسلمان بادشاہ کا کردار

ایک خط اور اُس کا جواب

از

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب مدظلہ شیخ الحدیث و صدر مفتی مدرسہ امینیہ کشمیری گیٹ دہلی

سابق ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند

شایع کردہ الجمعیۃ بکڈپو قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

قیمت 50 نئے پیسے

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب محترم اختر عالم صاحب زبیری نے ایڈیٹر صاحب روزنامہ
الجمعیۃ کو تحریر فرمایا تھا۔

"میں نے الجمعیۃ میں اسلام اور سوشلزم کے بارے میں جناب
مولانا محمد میاں صاحب کا فتویٰ پڑھا ہے جو بہت جامع ہے
اس سلسلہ میں حضرت مولانا سے گذارش ہے کہ آپ اسلامی
ممالک میں ڈیموکریسی پر روشنی ڈالیں۔ میرا خیال ہے کہ جہاں
اقتدار اعلےٰ مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے وہاں جملہ اختیارات
صدر کو حاصل رہنے چاہئیں نہ کہ وزیر اعظم کو کیونکہ اسلامی
ملک کا سربراہ امام ہوتا ہے۔ اگر میرا خیال صحیح ہے تو کسی بھی
اسلامی ملک میں موجودہ طرز کی جمہوری حکومت غیر اسلامی
ہے۔ پھر بھی علامہ مودودی پاکستان کی ڈیموکریسی پر خاموش
ہیں۔ امید ہے میرے اس استفسار کا جواب بھی شریعت
اسلامی کی روشنی میں دیا جائے گا۔
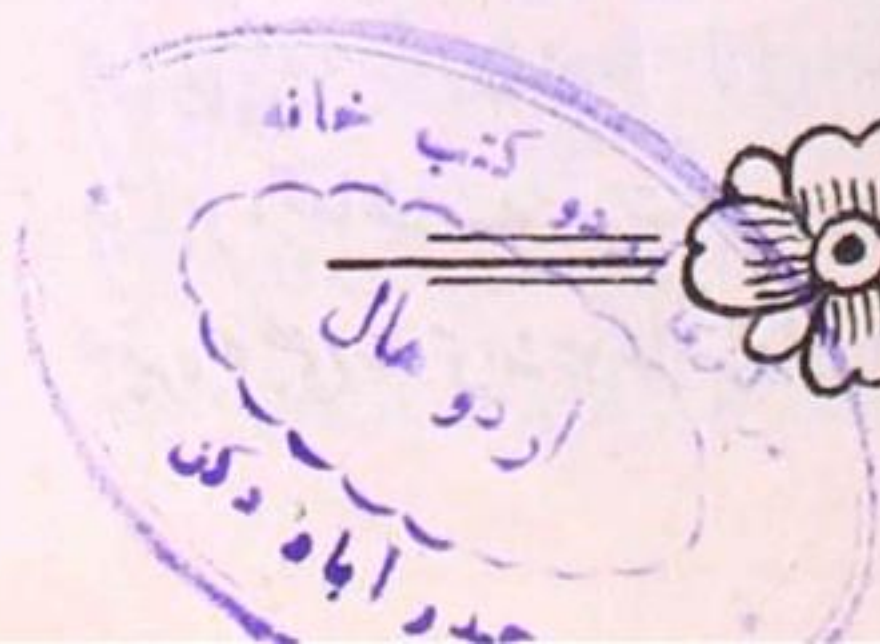
الجواب

جناب کا خیال صحیح ہے

اسلامی مملکت میں جملہ اختیارات ایک ہی کو دیئے جاتے ہیں اس کو امام کہا جاتا ہے۔ جو پوری مملکت کا واحد سربراہ ہوتا ہے۔ قرآن پاک کی تعلیم یہ ہے کہ وہ سربراہ اقتدار میں سب سے اعلےٰ ہو تو تقویٰ، پرہیزگاری اور خداترسی میں بھی اس کو سب سے بلند ہونا چاہیئے۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ۔ علماء نے امام کے لیئے چند شرطیں اسی لیے قرار دی ہیں کہ حتی الامکان قرآن پاک کی تعلیم کو جامۂ عمل پہنایا جاسکے۔ مثلاً عاقل، بالغ، تندرست، صحیح الحواس، صاحب ہمت، صاحب حوصلہ، صائب الرائے، سیاسی امور کا واقف و ماہر، جنگ و صلح کے نشیب و فراز سے باخبر، خلق خدا کا ہمدرد، عوام کا خیر خواہ، مختلف طبقات کے مزاجوں سے واقف ہونے کے علاوہ اہم شرط یہ ہے کہ اس میں عدل ہو یعنی پابند شرع ہو۔ اسلامی اخلاق کا حامل ہو، کبائر کا مرتکب نہ ہوتا ہو، بتقاضائے بشریت گناہ ہوجائیں تو فوراً توبہ کرلے۔ کسی گناہِ صغیرہ کا بھی عادی نہ ہو عالم ہو اور اسلامی علوم میں بصیرت رکھتا ہو۔

ازالۃ الخفار (حجۃ اللہ البالغہ وشرح عقائد نسفی وغیرہ)

وزیر اعظم کی جو حیثیت ہندوستان جیسے جمہوری ممالک میں ہے کہ پارلیمنٹ یا اسمبلی میں جس سیاسی پارٹی کو اکثریت حاصل ہو اس کا لیڈر وزیر اعظم یا چیف منسٹر ہو، اسلامی تعلیمات میں اس طرز کی اگر ممانعت نہیں کی گئی تو اس کی ہدایت بھی نہیں کی گئی۔

جمہوریت پر ایک نظر

کوئی بھی موسم ہو اس میں اس موسم کے خاص پھل کی بہار ہوتی ہے۔ زبانوں پر اس کا تذکرہ ہوتا ہے، دلوں میں اس کی رغبت اور خواہش، بازاروں اور منڈیوں میں اس کی کثرت ہوتی ہے۔ تجربہ نے چہرۂ جمہوریت کے خوشنما اور دلکش غازہ کو بڑی حد تک کھرچ دیا ہے۔ مگر تقریباً چالیس سال پہلے کا دور وہ تھا جس میں یورپ کی استعمار پسند حکومتیں دنیا پر چھائی ہوئی تھیں۔ وہ دور تصوّر جمہوریت کا موسم بہار تھا۔

شکنجۂ استعمار میں کسی ہوئی قوموں کے مضطرب جذبات تصور جمہوریت کا استقبال کر رہے تھے اور یہ تصور اہل دانش، اہل نظر اور اصحاب فکر کی عقل و دانش پر یہاں تک چھایا ہوا تھا کہ وہ کھینچ تان کر اسلام کو بھی اپنی ہی صف میں کھڑا کرنا چاہتے تھے کہ جمہوریت کے جس تخیل کو وہ متاعِ بے بہا سمجھ رہے ہیں اسلام بھی اس کی تعلیم دیتا ہے اور بازار سیاست

ہیں اس کا خریدار ہے ۔ لیکن اگر ہم جذبات سے بالا ہو کر حقیقت کو سامنے رکھیں تو حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی مذہب جمہوریت کی موافقت نہیں کر سکتا ۔ جس طرح جمہوریت اگر صحیح معنی میں جمہوریت ہے تو وہ مذہب کے تابع نہیں ہو سکتی کیونکہ ہم جمہوریت کے ثنا خواں و مداح اس لیے ہوتے ہیں کہ اس میں عوام کو آزادی میسر آتی ہے ۔ رائے کی آزادی ، منکر کی آزادی ، تحریر کی آزادی ، تقریر کی آزادی ، مطلق العنان حریت یعنی بے لگام آزادی ۔ حالانکہ کوئی بھی مذہب اس مطلق العنان ، بے لگام اور منہ چھوٹ آزادی کی اجازت نہیں دے سکتا ۔ ہر ایک مذہب اخلاق کا طوق زریں انسان کے گلے میں ڈالتا ہے اس کا اصل اُصول ہوتا ہے پابندی فرماں برداری ، ضبط و کنٹرول ، ایثار اور قربانی ۔ اس کے برعکس مطلق العنان آزادی جو جمہوریت کا طرۂ امتیاز مانی جاتی ہے ۔ رفتہ رفتہ آوارگی کی شکل اختیار کر لیتی ہے ۔

آپ تحقیق فرمائیں تو مہذب ترین جمہوری ممالک کاروباری ضابطوں اور قاعدوں میں وہ خواہ کتنے ہی با اصول ہوں ، مگر اخلاق ، کردار ، روحانیت خوف خدا اور خدا پرستی کے لحاظ سے وہ آوارہ اور شورہ پشت ہیں ۔

بے شک جمہوریت کا یہ رُخ قابل قدر ہے کہ اصولاً ایک فرقہ کو دوسرے پر مسلط نہیں کرتی ۔ اگرچہ عملاً اس سے نجات بھی نہیں مل سکتی کیونکہ

اکثریت اگر کسی ایک فرقہ سے تعلق رکھتی ہے تو وہ لامحالہ اپنی چھاپ جمہوریت پر ڈال دیتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ یہ سمجھنے لگتی ہے کہ جمہوریت کے معنی ہیں اکثریت کے ہم رنگ ہونا۔

فریبِ نظر اور طلسم

جمہوریت اور ڈیماکریسی کے ثناخواں جمہوریت کی خوبی یہ بیان کرتے ہیں کہ جمہوریت میں اقتدار اعلیٰ جمہور کو حاصل ہوتا ہے۔ حکومت جمہور کی ہوتی ہے اصل اختیارات جمہور کو حاصل ہوتے ہیں وہ اپنے لیئے اپنی مرضی کے مطابق دستورِ اساسی Constitution. اور قانون تجویز کر سکتے ہیں لیکن حقیقت پسندانہ نظر ڈالی جائے تو یہ تمام الفاظ طلسم اور جادو کے منتر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے جو دماغوں کو مسحور ضرور کر لیتے ہیں مگر حقیقت اور واقعیت سے آشنا نہیں ہوتے۔

جمہور کے پاس ووٹ کی طاقت ضرور ہوتی ہے مگر کیا اس حقیقت سے انکار ہو سکتا ہے کہ جس طرح گری نکال دینے کے بعد بادام کا چھلکا، کوڑا کرکٹ یا ایندھن بن جاتا ہے۔ ووٹ دینے والے بھی ووٹ دینے کے بعد بے مغز پوست بلکہ گرد یا بن جاتے ہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ مغز ہی اصل ہے۔ بادام کی گری ہی بادام کا حاصل ہے۔ اگر گری کام آرہی ہے تو بادام بے کار نہیں گیا۔ اور ضائع نہیں ہوا۔

عوام کے نمائندے قانون بنا رہے ہیں تو وہ قانون عوام ہی کا بنایا ہوا قانون ہے۔ اگر وہ نمائندے حکومت کر رہے ہیں تو وہ عوام ہی کی حکومت ہے۔

مگر کیا واقعی یہی ہوتا ہے کہ قانون عوام کے نمائندے بناتے ہیں اور عوام کے نمائندے ہی حکومت کرتے ہیں کون نہیں جانتا کہ اسّی فیصدی نمائندے وہ ہوتے ہیں جو قانون بنانے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ سینکڑوں ممبروں کے ایوان میں چند افراد کی کمیٹی بنا دی جاتی ہے جو قانون کا مسودہ تیار کرتی ہے۔ اصل واضع قانون یہ کمیٹی ہوتی ہے۔ دس پندرہ فی صدی وہ ہوتے ہیں جو قانون کو سمجھتے ہیں باقی تعداد جو سینکڑوں کی ہیبت انگیز اور مرعوب کن تعداد ہوتی ہے اس دس فی صد کی تقلید کرنے والی ہوتی ہے۔

جمہوریۂ ہند کا دستور اساسی جس پر مفکرین ہند کو ناز ہے بے شک وہ مجلس دستور ساز کا منظور کردہ ہے جس کے ارکان کی تعداد تقریباً پانچسو تھی جس میں اقلیتوں کو بھی مناسب نمائندگی دی گئی تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کا مسودہ ایک کمیٹی نے تیار کیا اور کمیٹی کے ارکان نے بھی سہولت کار کے لیے تدوین اور ترتیب کا کام ایک قابل شخص (ڈاکٹر امبیدکر) کے سپرد کر دیا تھا، مسودہ وہ تیار کرتے۔ کمیٹی کے ارکان بھی وقتاً فوقتاً ان کی مدد کرتے۔ بے شک وہ مسودہ ارکان کے سامنے پیش کیا گیا۔

اسمبلی کی اجلاس میں اس کی ایک ایک دفعہ پڑھی گئی۔ اس میں ترمیمات بھی ہوئیں لیکن یہ سب نقش و نگار کی تبدیلیاں تھیں۔ بنیادی ستون وہی رہے جن کی بنیاد ڈاکٹر امبیدکر نے ڈالی تھی۔

اور اگر ہم اس نمائش ہی کو حقیقت گردان لیں اور تسلیم کرلیں کہ دستور اساسی دستور ساز اسمبلی ہی کے ارکان نے مرتب کیا تھا اور ہر ایک رکن وضع قانون اور ترتیب دستور اساسی کی پوری صلاحیت رکھتا تھا اور اس نے ترتیب و تدوین میں پوری توجہ اور دماغ سوزی سے کام لیا ہے۔ تب بھی ظاہر ہے کہ اس دستور اساسی اور اس کی دفعات کی منظوری اکثریت کی رائے پر موقوف تھی اور ایوان میں اگر ایک پارٹی مثلاً کانگریس کی اکثریت تھی تو یہ دستور اساسی ایک پارٹی کا دستور ہوا اور جمہوریت کا مصداق صرف یہی اکثریت ہوئی۔

پھر ہو سکتا ہے کہ اس پارٹی کے ووٹوں کی مجموعی تعداد مخالفین کی تعداد سے کم ہو۔ مثلاً جمہور کے تیس فی صدی ووٹ کانگریس کو ملے۔ اور ستر فی صدی ووٹ دوسری پانچ چھ پارٹیوں میں تقسیم ہو گئے تو بے شک ایوان میں اکثریت کانگریس کو حاصل ہو گئی۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ مصنوعی اکثریت تیس فی صدی کی نمائندگی کرتی ہے اور اب جمہور کا اطلاق صرف تیس فی صدی پر ہو رہا ہے۔

یہ دستور اساسی کے وضع و ترتیب کی صورت تھی جس کو تمام قوانین میں بنیادی حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ جملہ قوانین اس ڈھانچہ کا گوشت پوست ہوتے ہیں جو دستور ساز اسمبلی دستور اساسی کی صورت میں تیار کرتی ہے۔

دستور اساسی کے علاوہ عام قانون جو اجلاسوں میں پیش ہو کر منظور ہوتے رہتے ہیں اور جمہوریت کے نام پر انھیں جمہور کے سر تھوپا جاتا ہے۔ ان کے واضعین درحقیقت وہ چند افراد ہوتے ہیں جو کابینہ (cabinet) کے رکن ہوتے ہیں۔ کینبٹ کا پیش کردہ مسودہ قانون پارٹی کو لامحالہ منظور کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اس کو مسترد کرنے کے معنی ہوتے ہیں گورنمنٹ پر بے اعتمادی ظاہر کرنا۔ مختصر یہ کہ عوامی حکومت اور جمہور کے اقتدار اعلیٰ کے نعرے صرف نمائشی ہوتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہوتی ہے کہ یہ اقتدار اعلیٰ چند افراد کے چھوٹے سے حلقے میں سمٹ کر رہ جاتا ہے

جمہوریت اسلام کی نظر میں

بے شک اسلام جمہوریت کا حامی ہے بلکہ بانی ہے۔ مگر اس کے معنے یہ ہیں۔

(۱) تمام انسان درجہ انسانیت میں مساوی ہیں وہ کالے ہوں یا گورے، عرب ہوں یا عجم، مشرقی ہوں یا مغربی۔ سب ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔

(۲) ایک انسان کا درجہ دوسرے انسان سے اگر بلند ہے تو وہ رنگ، نسل، دولت ثروت یا کسی جغرافیائی بنیاد پر نہیں بلکہ درجہ اگر بلند ہو سکتا ہے تو صلاحیت اور قابلیت کی بنیاد پر۔ اور اللہ تعالیٰ کے یہاں درجہ کی بلندی تقوے کی بنیاد پر ہوتی ہے۔

(۳) بادشاہت، اقتدار اعلیٰ کو نسل اور خاندان کے تابع کرتی ہے کہ باپ بادشاہ تھا تو بیٹا بھی بادشاہ ہوگا۔ اسلام اس سے نفرت کرتا ہے۔ ملک الاملاک اور شاہنشاہ جو دنیا میں سب سے زیادہ باعظمت لفظ ہے اللہ تعالےٰ کے یہاں سب سے زیادہ قابل نفرت ہے۔ (بخاری شریف ۹۱۶)

وہ اقتدار اعلیٰ کو صلاحیت اور قابلیت کے تابع کرتا ہے (سورہ ۲ (البقرہ) آیت ۲۴۷)

(۴) ہر شخص ذمہ دار ہے وہ اپنی ذمہ داری کے بارے میں جواب دہ ہے۔ غریب ہو یا امیر۔ حاکم ہو یا محکوم

(۵) امام (سربراہ مملکت) مملکت کا سب سے بڑا ذمہ دار ہے مگر وہ مشورہ کا پابند ہے اور مسلمانوں کے تمام معاملات مشورہ سے طے پاتے ہیں۔

وضع قانون اگر کسی ایک شخص کو یہ حیثیت نہیں دی جا سکتی کہ

وہ خلق خدا کا مالک ہو اور جو کچھ وہ کہدے قانون بن جائے اگر اس کو استبداد اور جبر و قہر کہا جاتا ہے تو چند افراد کو بھی یہ حیثیت نہ ملنی چاہیئے کہ وہ قانون ساز بن کر خلق خدا کی جان اور ان کی ملکیتوں میں تصرفات کریں۔

واضع قانون خود تصرف نہیں کرتا یعنی کسی کو پھانسی، کسی کی جاں بخشی، کسی کے قید و بند کسی کے مال ضبط کر لینے اور کسی پر جرمانہ کر دینے کا عمل وہ خود نہیں کرتا مگر جب ان امور کے ضابطے اور قاعدے مقرر کر کے تصرف کرنے والے کے تصرف کو جائز قرار دیتا ہے تو یہ خود ایسا عمل ہے جس کا دائرہ اثر اس کے اپنے تصرف سے بھی زیادہ وسیع ہے۔

کسی کا گلا گھونٹ کر مار ڈالنا ظالمانہ تصرف ہے مگر اس کا مظلوم یعنی اس سے متاثر ہونے والا صرف ایک شخص ہے مگر ایسا ضابطہ بنا دینا کہ فلاں عمل کرنے والے کو گولی مار دی جائے اور فلاں عمل کرنے والے کی جائیداد ضبط کر لی جائے۔ ایسا تصرف ہے جس کا تختۂ مشق ایک دو نہیں بلکہ لاتعداد و بے شمار انسان ہوتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ کسی آرڈی ننس کا جاری کر دینا ایسا تصرف ہے جو پورے ملک کے تمام باشندوں کو متاثر کرتا ہے۔

اسلام جس طرح ملوکیت اور شہنشاہیت کو انسانی بھائی چارے

اور انسانی مساوات کے خلاف سمجھتا ہے، وہ افراد انسان کی کسی جماعت یا کسی کمیٹی کو بھی وضع دستور اساسی کا اختیار دینا مساوات انسانی کے خلاف سمجھتا ہے۔

ان کا علم محدود، مستقبل کی ان کو خبر نہیں، حال پر بھی ان کو پورا اختیار نہیں وہ انسانی طبقات کے مختلف جذبات سے ناواقف فطری رجحانات جو ایک ہی نوع کے مختلف صنفوں میں مختلف ہوتے ہیں۔ ان سے بھی وہ پوری طرح باخبر نہیں۔ وہ اپنے جیسے انسانوں کے لیے قانون بنائیں اور ان کی گردنیں خود ساختہ دستوری دفعات کے شکنجے میں کسیں مساوات انسانی کا نازک نظریہ اس کو برداشت نہیں کرتا۔ اسی لیے وہ وضع قانون کا اختیار صرف اس کو دیتا ہے جو حقیقی مالک ہے۔ اور چونکہ وہ خالق ہے لہذا وہ ان تمام جذبات ورجحانات سے واقف ہے جو انسانوں کے مختلف طبقات اور نوع انسان کی مختلف صنفوں میں ہوتے ہیں۔ اور چونکہ وہ خالق اور مالک ہے اس کو حق ہے کہ اپنی مخلوق کے بارے میں جو چاہے فیصلہ کرے اور جو چاہے ان کے لیے دستور بنائے۔

انسان کا انسان کے لیے قانون بنانا سراسر بے محل اور ایک طرح کا جبر وقہر ہے۔ اس لیے قرآن حکیم ان سب کو ظالم وفاسق یا کافر قرار دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے مرتب کردہ دستور اساسی کے خلاف کوئی دستور

بنائیں یا ایسے دستور کو تسلیم کرتے ہوئے فیصلہ خداوندی کے خلاف کوئی فیصلہ صادر کریں۔ (سورۂ مائدہ - آیت ۴۴ تا ۴۷)

اس نظریے اور فکر کے بموجب جب انسان کو قانون سازی کا حق نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے دائرہ اقتدار میں نہ دستور ساز اسمبلی ہوگی نہ آئین ساز کونسل نہ ان کے انتخابات ہوں گے اور نہ وہ بے پناہ مصارف ہوں گے جو پارلیمنٹ، کونسل، ان کے عہدہ داروں، وزراء اور منسٹروں پر ہوتے یا ان کے انتخابات کے سلسلہ میں برداشت کیئے جاتے ہیں۔

دستور اساسی اسلامی نقطۂ نظر سے قرآن حکیم دستور اساسی ہے جس کی تشریح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، پھر حضرات خلفاء راشدین کے طریقہ ہائے کار اور جماعت صحابہ کے طرز عمل نے کی۔ اسی کا نام الشریعۃ الدین۔ اور السنۃ ہے۔

اس دستور اساسی کی موجودگی میں کوئی اور دستور وضع نہیں کیا جائے گا۔ البتہ پیش آنے والے معاملات کے مطابق اسی دستور کے اصول مسلمہ سے ضابطے اور قاعدے اخذ کیئے جائیں گے اور ان کی روشنی میں معاملات کے فیصلے ہوں گے۔

مجلس آئین ساز کے بجائے عدالت عالیہ اپنی جان، اپنا مال،

غیر کی جان اور اس کا مال، رشتہ دار۔ پڑوسی۔ شہری۔ ملکی غیر ملکی۔ غیر مسلم وغیرہ کے حقوق، فرائض، جرائم کی حیثیت۔ ان کی سزائیں، جنگ وصلح کے بنیادی ضابطے۔ خرید و فروخت۔ وہبہ عاریت۔ اجارہ تحفظ، نسل، ازدواجی تعلقات وغیرہ کے ضابطے اور اصول قرآن حکیم اور سنت نبویہ (علےٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) نے مقرر کر کے انسان کو وضع دستور اور قانون سازی کی الجھنوں سے آسودہ اور اس کی ذمہ داریوں سے سبک دوش کر دیا ہے صرف وہ کام باقی ہے جو کسی قانون کے پیش نظر عدالت کو کرنا پڑتا ہے۔

پیش آنے والے معاملات میں ہماری عدالتیں پارلیمنٹ یا اسمبلی کے وضع کردہ دستور یا قانون کو تلاش کرتی ہیں اس کا منشار سمجھتی ہیں اور اس کی رہنمائی میں فیصلہ کرتی ہیں۔ اسلامی عدالتیں قرآن اور سنت کی روشنی میں فیصلہ کریں گی۔

اراضی کی ملکیت، ملکیت کی نوعیت واجبات یعنی پیداوار کے سلسلہ میں سرکاری مطالبات، افتادہ اراضی، کانوں اور چشموں کی حیثیت پہاڑ، دریا، ان کی قدرتی پیداوار وغیرہ کے متعلق سوالات پیدا ہوئے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی روشنی میں ایک مجموعہ قانون مرتب کر دیا جو کتاب الخراج

کے نام سے مشہور ہے۔ خلافت عباسیہ کے دور میں اسی نے آئین کی حیثیت اختیار کرلی پیش آنے والے سوالات کے متعلق مجلس قانون سازی کی ضرورت نہیں ہوئی بلکہ اسی آئین کے مضمرات سے جوابات اخذ کیے گئے اور انھیں کو (Bye Laws.) اور ضمنی قوانین کی حیثیت دی گئی۔

اسلامی نظام حکومت کا مقصد

دستور اساسی (کتاب اللہ وسنت رسول اللہ) اور عدالت عالیہ کے بعد معاملہ صرف نفاذ کا رہ جاتا ہے۔ جس کے لیے انتظامی عملہ کی ضرورت ہے۔ مقننہ کی نہیں۔ اسلامی حکومت کا پورا نظام اس لیے ہوتا ہے کہ قانون اسلامی کو نافذ کرے اور جو حکومت اسی مقصد کے لیے ہو وہ اسلامی حکومت ہے

تشکیل حکومت اور سربراہ مملکت

قرآن حکیم یا احادیث مقدسہ نے تشکیل حکومت کے لیے کوئی خاص ضابطہ مقرر نہیں کیا ہے۔ صرف ایک بنیادی تعلیم دی ہے کہ سربراہ کا تقرر نسل اور خاندان کی بنا پر نہ ہو اہلیت اور صلاحیت کی بنا پر ہو یہ سربراہ کس طرح بنایا جائے کتاب وسنت نے اس کو بھی موضوع بحث نہیں بنایا۔ البتہ سربراہ کے اوصاف بیان کر دیئے ہیں اور اس کے فرائض مقرر کر دیئے ہیں

(۱) اسلامی مملکت کا سربراہ عوام کی آراء سے بھی منتخب کیا جاتا

سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ مدارِ انتخاب وہ اوصاف ہوں جو اسلامی حکومت کے سربراہ میں ہونے چاہئیں جو آغازِ مضمون میں بیان کیے گئے ہیں۔

(۲) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ سربراہ جو اِن اوصاف کا حامل ہو انتخاب کے قصے میں نہ پڑے اور خود اپنی جانب سے اپنا کوئی ایسا قائم مقام نامزد کرے جو اِن اوصاف کا حامل ہو اور عوام میں متعارف ہو۔

(۳) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سربراہ جو اوصافِ سربراہی کا صحیح طور پر حامل ہو اپنی جانب سے کچھ اہل الرائے حضرات کو نامزد کر دے کہ وہ آیندہ کے لیے کوئی سربراہ نامزد کر دیں جو اوصافِ سربراہی سے متصف ہو۔

اسلام جبر و قہر کی اجازت نہیں دیتا لیکن اگر کوئی اپنی طاقت کے بل بوتے پر سربراہ بن جائے تو مسلمان اس کی قیادت تسلیم کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرے اور ایسے اوصاف کا حامل ہو جو فرائض ادا کرنے کے لیے ضروری ہیں۔

مشورہ اور ارکانِ مشورہ (شوریٰ)

اسلام نے جس طرح تشکیلِ حکومت کو کسی خاص نوعیت کے ساتھ مخصوص نہیں کیا اسی طرح ارکانِ شوریٰ کے انتخاب یا نامزدگی کا بھی کوئی ضابطہ نہیں مقرر فرمایا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ جن امور کا تعلق الٰہیات (اللہ

تعالیٰ کی ذات وصفات) اور عبادات سے نہیں ہے بلکہ ان کا تعلق تجربات اور مشاہدات سے ہے۔ اسلام نے ایسے امور میں فکر انسانی کو آزاد چھوڑا ہے۔ بہرحال اگرچہ ارکانِ شوریٰ کے انتخاب وغیرہ کے بارے میں کوئی ضابطہ مقرر نہیں کیا مگر سربراہ پر یہ لازم کر دیا ہے کہ وہ اپنے ہر ایک منصوبہ کے متعلق مشورہ کرے۔ عمل کرنے کا عزم اس وقت کرے جب پہلے مشورہ کر لے۔ پہلے مشورہ - پھر خدا پر بھروسہ - ان دو کے بیچ میں عزم ہونا چاہیئے۔ (سورہ ۳ آل عمران آیت ۱۵۹)

پھر مشورہ کو یہاں تک اہمیت دی گئی ہے کہ اس معاملہ کو مسلمانوں کا معاملہ ہی نہیں قرار دیا جو آپس کے مشورہ سے طے نہ ہو۔

(سورہ ۴۲ شوریٰ آیت ۳۸)

جب کہ مجلس شوریٰ کے لیے کوئی ضابطہ مقرر نہیں تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ

(۱) ارکان شوریٰ کا انتخاب عوام کی رائے سے ہو۔ بشرطیکہ مدار انتخاب ان کے وہ اوصاف ہوں جو اسلامی مملکت کے مشیر کے ہونے چاہئیں

(۲) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ الگ الگ انتظامی حلقے ہوں اور ان حلقوں کے سربراہ پوری مملکت کے سربراہ کا انتخاب کریں۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے دور مسعود میں کچھ حلقے ہوتے تھے ان

حلقوں کے سربراہ کو نقیب کہا جاتا تھا۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اسیرانِ ہوازن کی واپسی کے متعلق عوام کی رائے معلوم کرنی چاہی تو مجمع عام میں جو پکار دیا گیا تھا کہ "ہم راضی ہیں" اس پر اعتماد نہیں فرمایا۔ بلکہ ان عرفاء (امیران قبیلہ یا محلہ) کو ہدایت فرمائی کہ وہ اپنے طور پر اپنے اپنے حلقہ میں فرداً فرداً ہر ایک کی رائے معلوم کریں۔ جب ان کی رپورٹیں موصول ہوگئیں تب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا (بخاری شریف صفحہ ۳۵۵ وغیرہ)

(۳) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سربراہ مملکت ان لوگوں کو خود نامزد کر دے جو ووٹنگ کے ذریعہ نہیں، بلکہ اپنے اخلاق، کردار، اپنی قابلیت اور صلاحیت اور خدمات کی وجہ سے اوپر آچکے ہوں۔ اور بہتر کردار کے مالک ہونے کی وجہ سے وہ ممتاز شخص بن چکے ہوں۔

(۴) ایک شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ نامزد یا منتخب کسی کو بھی نہ کیا جائے بلکہ ہر پیش آنے والے معاملہ میں، اس معاملہ سے تعلق رکھنے والے صاحب بصیرت اور تجربہ کار حضرات کو دعوت دی جائے اور ان سے فیصلہ کرایا جائے۔

کتاب وسنت کے اشارات کے بموجب سب سے اہم اور سب سے بنیادی بات سربراہ کا "تقویٰ" ہے۔ اس کے دل میں خدا کا خوف ہو، نوع

انسان اور خلق خدا کا ہمدرد ہو، صاحب بصیرت، دیانت دار، باحوصلہ او
بیدار مغز ہو اور فرائض کی ادائیگی کی لگن رکھتا ہو۔

اگر مملکت کو اس طرح کا سربراہ میسر آگیا ہو تو نہ اس کو پارلیمنٹ
کی ضرورت ہے نہ مجلس وزرار کی۔ خصوصاً ع۳ و ع۴ والی صورتیں اسی وقت
صحیح قرار دی جاسکتی ہیں جب سربراہ میں اخلاص، کردار اور پاکبازی ہو
مقصد یہ ہے کہ باخدا اور خدا ترس ڈکیٹٹر ہزاروں پارلیمنٹ اور اسمبلیوں
سے بہتر ہے۔ خوف خدا نہ ہو تو سب بے کار

شوریٰ کا کام

بے شک دستور اور قانون بنانا شوریٰ سے متعلق
نہیں ہے۔ مگر نفاذ دستور کے سلسلہ میں بہت سے
مرحلے ایسے آتے ہیں جس کو اگر شوریٰ کے بغیر امام اور سربراہ اپنی رائے
سے طے کرئے تو جبر و قہر اور استبداد قرار دیئے جائیں گے ان میں نہ
صرف شوریٰ کی ضرورت ہو گی بلکہ یہ بھی ضروری ہوگا کہ ارکان شوریٰ
بارسوخ ہوں، عوام کے مزاج کو پہچانتے ہوں اور عوام بھی ان پر اعتماد
کرتے ہوں، ان کی رائے عوام کی رائے ہو اور فی الواقع عوام کے
ترجمان ہوں۔

مثال

صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے جس سے شوریٰ کی ضرو
اس کی نوعیت اور اس کے فرائض کا اندازہ ہو جائے گا

سورہ ۸ انفال کی آیت ۶۰ کا مفاد یہ ہے کہ مسلمانوں کو بین الاقوامی سیاست کے اسٹیج پر اس طرح بالادست ہو کر رہنا چاہیئے کہ دوسری قومیں ان سے متاثر رہیں اور اس کے لیے جس قسم کے سازو سامان کی ضرورت ہے مسلمانوں پر فرض ہے کہ اس کو تیار رکھیں"۔

آج دنیا میں روس اور امریکہ کے درمیان سرد جنگ جاری ہے ہر ایک بلاک دوسرے کو مرعوب کر رہا ہے۔ یہ میدان مسلمانوں سے خالی ہے۔ بین الاقوامی سیاست میں مسلمانوں اور ان کی تمام مملکتوں کا شمار پسماندہ اقوام میں ہوتا ہے۔ حاشا و کلا قرآن حکیم مسلمانوں کے لیے یہ ذلت گوارا نہیں کرتا۔ قرآن پاک کی تلقین یہ ہے "کلمۃ اللہ ھی العلیا" اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو یہ نعرہ دیا تھا الاسلام یعلو ولا یعلی علیہ اسلام بلند ہو کر رہتا ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ دوسروں کو اسلام پر بلندی حاصل ہو۔ سائنسی تحقیقات اور ترقی کا کام دوسروں نے لے لیا اسی راستہ سے وہ دنیا پر چھائے ہوئے ہیں اور تمام دنیا کو مرعوب کر رہے ہیں قرآن حکیم کی تعلیم اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے بموجب اسلامی حکومت کو ایسا بیدار مغز ہونا چاہیئے کہ اس میدان میں بھی اس کا قدم سب سے آگے رہے وہ کسی کے دست نگر نہ رہیں دوسروں کو ان کا دست نگر رہنا چاہیئے۔

وہ اللہ کے سوا کسی دوسرے سے خائف نہ ہوں دوسروں پر ان کی
دھاک رہنی چاہیئے۔ سورہ ع۹ توبہ آیت ۱۲۳)

اس ترقی اور برتری کے لیے بہت زیادہ دولت کی ضرورت ہے۔
زکوٰۃ وصدقات اور عشر جو خوش حال مسلمانوں پر فرض ہوتے ہیں وہ ضرورتمند
عیال دار، فقراء و مساکین کا حصہ ہیں ان کی رقومات ان مدات پر ہی خرچ
کی جائیں گی۔ ترقی اور استحکام قوت کے مدات پر خرچ نہیں ہوں گی۔

خراج، جزیہ اور اسلامی تعلیم کے بموجب عشور یعنی درآمد و برآمد مال
کے ٹیکس اور اس طرح کے معینہ مدات آمدنی اگر ان ضرورتوں کے لیے ناکافی
ہوں (جو ترقی پذیر تعلیم و تربیت اور ریسرچ و تحقیقات اور سامان جنگ کی فراہمی
وغیرہ کے سلسلہ میں لازمی ہیں) تو مجلس شوریٰ یہاں اپنا فرض انجام دیگی
یعنی ماہرین کی امداد سے ذرائع آمدنی میں اضافہ کرے گی۔

کارخانے اور فیکٹریاں

یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ لوگ اپنی محنت اور اپنی گاڑھی کمائی سے
کارخانے اور مل قائم کریں اور حکومت ان کو نیشنلائز کر کے اپنے قبضہ میں
لے لے۔ حکومت کو غاصب نہ ہونا چاہیئے بلکہ حکومت کو ایسا فرض شناس ہونا
چاہیئے کہ وہ پہلے ہی اپنی طرف سے بڑے بڑے کارخانے قائم کر کے اپنی آمدنی میں اضافہ کرے

ترقیاتی پلان اور منصوبے آج بھی پارلیمنٹ اسمبلی یا مجلس وزراء نہیں بناتی۔ بنانے والے اور ہوتے ہیں۔ پارلیمنٹ ان کی منظوری دیتی ہے کیا اچھا ہو کہ شوریٰ کے ارکان وہ ماہر ہوں جو اس طرح کے منصوبے بنا سکیں آخر ایسے ہی ماہرین کو شوریٰ کا (پارلیمنٹ) ممبر کیوں نہیں بنایا جاتا کیا وہ عوام کی ضرورتوں اور رجحانات سے بے خبر ہوتے ہیں؟ وہ عوام کی نمائندگی کیوں نہیں کر سکتے؟۔

خسارہ کو پورا کرنے والا آمدنی کا ایک مد

قرآن حکیم نے ایک مستقل مد قرار دیدیا ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ۔ (راہ خدا میں خرچ کرنا) چنانچہ سورہ ۸ انفال کی مذکورہ بالا آیت کا آخری حصہ یہ ہے۔

اللہ کے راستہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے وہ تم کو پورا پورا ادا کیا جائے گا۔ اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا (آیت ۶۰۔ الانفال)

سورہ ۴۷ محمد کی آخری آیت ۳۸ کا مفہوم یہ ہے۔

"تم کو دعوت دی جا رہی ہے کہ تم راہ خدا میں خرچ کرو تم میں سے کچھ وہ ہیں جو اس دعوت کے جواب میں بخل سے کام لیتے ہیں (خرچ نہیں کرتے)

دیکھو یہ اگر بخل کرتے ہیں تو اپنے سے (اپنے مفاد سے) بخل کر رہے ہیں۔ اللہ کو ضرورت نہیں ہے وہ بے نیاز ہے (اعلیٰ تعلیم۔ ترقی پذیر تربیت۔ سائنسی ایجادات و ترقیات یہ تمہاری ہی ضرورتیں ہیں) تم ہی ضرورت مند ہو (خود تمہاری باعزت بقا کے لیے ان کی ضرورت ہے۔) اگر تم منہ موڑتے ہو تو تم ختم ہو جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے بدلہ میں کسی دوسری قوم کو کھڑا کرے گا۔ جو تم جیسی تن آسان فرض ناشناس۔ اور مفاد پرست نہیں ہوگی۔

سورہ ع۲ بقرہ میں جنگ و قتال کے متعلق ہدایات دینے کے بعد ارشاد ہے۔ خرچ کرو اللہ کے راستہ میں اور نہ ڈالو اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں بربادی (اور ہلاکت) میں (آیت ۱۹۵)

قرآن حکیم میں اس انفاق فی سبیل اللہ کو "قرض حسن" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ گویا قومی یا ملی قرض ہوتا ہے۔ ہماری حکومتیں بھی قومی یا جنگی قرض لیتی ہیں جن کا سود بھی ادا کرتی ہیں۔ مگر اس سود کے نتیجہ میں ان قومی اور جنگی قرضوں کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ دولت مند جو قرض دیتے ہیں ان کی دولت بڑھ جاتی ہے اور اس تمام قرض کا بار ملک کے تمام غریب ٹیکس دینے والوں پر پڑتا ہے۔

دولت مند یہ قرض دے کر بظاہر قوم کی خدمت کر رہا ہے۔ لیکن فی الحقیقت قوم کا خون چوس رہا ہے اور اپنی امیری بڑھا رہا ہے۔ قرآن حکیم جس قرض کا مطالبہ کرتا ہے اس کا کوئی بار غریب اور محنت کش طبقہ پر نہیں پڑتا۔ صرف دولت مند پر اس کا بار پڑتا ہے۔ اسی کی گرہ میں سے اس کی خالص پونجی صرف ہوتی ہے اگرچہ یہ وعدہ بھی ہے۔

"کہ تم کو پورا پورا ادا کیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں ہوگا" (سورۂ انفال - آیت ۶۰)

اس کے پورا پورا ادا کرنے کی شکل یہ ہے کہ ترقیات کے مفادات سے یہ دولت مند بھی بہرہ اندوز ہوں گے۔ چنانچہ جن صحابہ کرام نے ارشاد خداوندی کی تعمیل کرنے کے لئے خرچ کیا تھا ان میں بہت سے وہ بھی تھے کہ ثواب آخرت کے علاوہ دنیا میں بھی ان کو پورا پورا بلکہ پورے سے بھی بہت زیادہ ادا کر دیا گیا۔

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کی حالت ابتدائے زمانہ میں یہ تھی کہ ان کی اہلیہ محترمہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا اونٹ کے چارے اور چولھے کے سوختہ کے لئے گٹھلیوں وغیرہ کا بار دو تین میل کے فاصلہ سے خود اپنے سر پر رکھ کر لایا کرتی تھیں۔ تقریباً تیس سال بعد جب وہ شہید ہوئے تو ان کا ترکہ پانچ کروڑ سے زیادہ کا تھا۔ جو قطعاً جائز اور پاک آمدنی سے حاصل ہوا

تھا۔ جب کہ تمام غزوات میں پیش پیش رہا کرتے تھے اور کروڑوں درہم راہ خدا میں خرچ کئے تھے۔ (بخاری شریف ص۴۴۱ و ص۴۴۲)

دوسری شکل

اور پورا پورا ادا کرنے کی دوسری شکل یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کے مدارج اتنے بڑھائے جائیں کہ ان کا اندازہ لگانا مشکل ہو وہ اس زمرہ میں ہوں جن کو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی طرح "منعم علیہم" فرمایا ہے اور ان کو ابدی حیات کی بشارت دی ہے۔

بہر حال اس قرض کی ادائیگی باشندگان ملک کی جیب سے نہیں ہوگی۔ ارکان شوریٰ کا فرض ہوگا کہ اسلامی مملکت کی ترقی پذیر ضرورتوں کا جائزہ لیں۔ ان کا بجٹ بنائیں۔ بجٹ کو پورا کرنے کے لیے قرض حسن حاصل کریں۔ دولت مندوں کا فرض ہوگا کہ جو ان کے ذمہ کیا جائے وہ اس کو خوش دلی سے ادا کریں یہ ان کے لیے ذخیرۂ آخرت ہوگا۔ زکوٰۃ کی طرح اسکی ادائیگی بھی فرض ہوگی اور زکوٰۃ کی طرح اس کا ثواب بھی بیش از بیش ہوگا۔ جس کی تائید بے شمار آیات اور احادیث سے ہوتی ہے۔

اس قرض للہ اور فی سبیل اللہ کی شرح کیا ہوگی۔ اگر امام از خود کسی آرڈی ننس سے طے کر دیتا ہے تو ایک طرح کا جبر ہوگا۔ لیکن اگر ارکان شوریٰ جو با اثر اور بارسوخ بھی ہوں وہ طے کرتے ہیں تو سب کے لیے قابل برداشت ہوگا

اسی طرح ترقی پذیر اعلیٰ تعلیم اور تربیت کی ضرورتیں ہیں۔ ان کے مصارف بھی ایسی ہی آمدنی یا قرض اللہ سے پورے کیے جائیں گے۔ شوریٰ کا فرض ہوگا کہ ان تمام ضرورتوں کا جائزہ لے کر بجٹ بنائے ممکن ہے اس کو قانون سازی کہہ دیا جائے مگر ہمارے خیال میں یہ قانون اور "لا" نہیں بلکہ یہ حکم خداوندی کے نافذ کرنے کی صورتیں ہیں۔

دولت کا اندازہ

زکوٰۃ کی رقم ان مدات میں خرچ نہیں ہوگی البتہ زکوٰۃ سے دولت کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس نے ایک ہزار روپیہ زکوٰۃ میں دیا ہے اس کا کل اثاثہ چالیس ہزار ہوگا۔

بہر حال اس قسم کے کام ہوں گے جن کو ارکان شوریٰ زیر قیادت امام انجام دیں گے۔ (یہ ہے اسلامی نظام حکومت کا مختصر خاکہ)

اس تاریخی حقیقت پر سلسلہ کلام کو ختم کیا جاتا ہے کہ خاتم الانبیاء محمد صلے اللہ علیہ وسلم جو رحمۃ للعالمین بنا کر مبعوث کئے گئے تھے سب سے پہلے آپ ہی نے دفاع کے لیے خندق کی تجویز منظور فرمائی۔ عرب اس سے قطعاً نا آشنا تھے۔ جب حملہ آوروں نے جن میں تقریباً پورے عرب

کے قبائل تھے دفاع کا یہ نیا طریقہ دیکھا تو حیران رہ گئے۔ اگرچہ فتح نصرت خداوندی سے ہوئی مگر یہ خندق دشمن کی ناکامی کا پیش خیمہ بن گئی۔

پھر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ہی سب سے پہلے منجنیق اور دبابہ کا استعمال کرایا جب آپ قلعہ طائف پر حملہ کر رہے تھے۔ یہ اس زمانہ کے ترقی یافتہ آلات حرب تھے۔ جن کو تاریخ اسلام میں سب سے پہلے رحمتہ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم نے استعمال فرمایا۔ کیونکہ مقصد رحمت اس وقت تک پورا نہیں ہوتا جب تک ظلم کی طاقتیں پامال نہ ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ تمام عالم پر چتر رحمت اسی وقت سایہ فگن ہو سکتا ہے جب بین الاقوامی سیاست میں بالادستی اور شان قیادت حاصل ہو۔ ہم سود کو بدترین ظلم سمجھتے ہیں مگر ہم تمام احتیاطوں کے باوجود سود لیتے بھی ہیں اور دیتے بھی۔ ہیں۔ کیونکہ جس اقتصادی نظام میں ہم جکڑے ہوئے ہیں وہ بینک سسٹم ہے۔ اور جب تک اقتصادیات عالم کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں نہ ہو آپ بینک سسٹم ختم کر کے کوئی متبادل نظام نہیں قائم کر سکتے۔

سود کے متعلق قرآن حکیم کا فیصلہ دستور اساسی کی ایک دفعہ ہے مجلس شوریٰ اس میں تبدیلی نہیں کر سکتی البتہ اس کو نافذ اور بروئے کار لانے کی صورتیں طے کرنا اس کا فرض ہوگا۔

مگر افسوس اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی کوئی حکومت بھی اس

اس قابل نہیں کہ بین الاقوامی سیاست پر اثر انداز ہو سکے اور افسوس یہ ہے کہ ان کو اس کا احساس نہیں کہ حامل قرآن ہونے کی حیثیت سے ان کا کیا فرض ہے! والی اللہ المشتکی

محمد میاں عفی عنہ
۸ رجمادی الاخری ۱۳۸۹ھ ۲۲ راگست ۱۹۶۹ء

مسلمان بادشاہ کا کردار

اسلام نے اگرچہ ملوکیت اور شاہنشاہیت سے نفرت کی اور حکومت کو ایک باہمی تعاون کا ادارہ قرار دیا ہے لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس پر عمل بہت کم ہوا اس کے برعکس تاریخ اسلام میں ایسے شمشیرزن و کشور کشا بہت سے گذرے جنھوں نے اسلامی طرز کے خلاف تلوار کے زور سے اقتدار اعلیٰ حاصل کیا۔ تاج شاہی سر پر رکھا لیکن پھر یہ بھی چاہا کہ وہ دین کی خدمت کریں اور ان کو خادم دین۔ حامی شریعت۔ رحم دل انصاف پسند بادشاہ۔ کہا جائے۔ حضرات علماء اور مشائخ کرام اس طرح کی ملوکیت سے خوش تو کبھی نہیں ہوئے البتہ جب یہ یقین کرلیا کہ اس اقتدار کے خلاف بغاوت ملوکیت سے زیادہ تباہ کن ہوگی۔ تو پھر ان کی کوشش یہ رہی کہ اس اقتدار کو عدل و انصاف اور احکام شریعت کے راستہ پر لگایا جائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جو بادشاہ کامیاب مانے گئے وہ وہی تھے جنہوں نے حضرات علماء و مشائخ کرام کی ہدایتوں کو تسلیم کیا اور ان کے مشوروں کو عملی جامہ پہنایا۔ علماء کرام یا حضرات مشائخ ان بادشاہوں کو کیا نصیحتیں کیا کرتے تھے وہ نصیحتیں گلستاں۔ بوستاں۔ اخلاق محسنی جیسی کتابوں میں ملاحظہ

کیجا سکتی ہیں یہاں صرف ان ہدایتوں کے چند اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں جو حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ نے خلفاء عباسیہ میں سب سے زیادہ با اقبال اور نامور خلیفہ ہارون الرشید کو کی تھیں

امیر المومنین۔ یاد رکھیے۔ جس عمارت کی بنیاد تقویٰ پر نہ ہو وہ سر بلند نہیں ہو سکتی اللہ تعالیٰ اس کو جڑ سے اکھاڑ دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو قیادت آپ کو عطا فرمائی ہے ایسا ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ آپ اس کو برباد کر ڈالیں۔ آج کے کام کو کل پر مت رکھو۔ آرزوئیں بہت ہوتی ہیں مگر فرشتہ موت ان سے پہلے آپہنچتا ہے۔ موت سے پہلے عمل کر لو۔ موت کے بعد کوئی عمل نہیں ہو سکتا۔ آپ ٹیڑھے نہ چلیں۔ پھر رعیت بھی ٹیڑھی راہ اختیار کرے گی۔ اس کا بار آپ پر ہوگا۔

آخرت کے کام کو دنیا پر مقدم رکھو، آخرت سدا رہنے والی ہے۔ دنیا ختم ہو رہی ہے۔ تمام انسانوں کو حکم خداوندی کے بارے میں ایک سطح پہ رکھو، وہ اجنبی ہوں یا رشتہ دار، خدا کے معاملے میں کسی کی ملامت کا خوف ہرگز مت کرو۔ تقویٰ اور پرہیزگاری دل سے ہوتی ہے زبان سے نہیں۔ دل میں خدا کا خوف پیدا کرو۔ دنیا کی زندگی خواہ کتنی ہی طویل ہو مگر جب میدان حشر میں خدا کے سامنے کھڑا ہونا ہوگا تو ایسا معلوم ہوگا کہ دنیا میں صرف ایک صبح اور ایک شام قیام ہوا تھا۔

قیامت کے روز بارگاہ خداوندی میں پہلے چار چیزوں کا حساب دینا ہوگا۔ اس کے بعد بندہ عدالت کے کٹہرہ سے نکل سکے گا۔

(۱) جو مال تمہارے پاس تھا وہ کہاں سے حاصل کیا تھا اور کس کام میں صرف کیا۔

(۲) جو تم جانتے تھے اس پر کیا عمل کیا۔

(۳) جو عمر ملی تھی وہ کن باتوں میں ختم کی۔

(۴) جو جسم تمہیں میسر تھا کن کاموں میں اس کو بوسیدہ کیا۔

قوم کے ذمہ داروں۔ اولی الامر کو اللہ تعالیٰ نور عطا فرماتا ہے۔ قوم اس

نور سے فیضیاب ہوتی ہے۔ اس نور کی روشنی یہ ہے کہ اللہ کی مقرر کردہ حد بندیاں صحیح طور سے قائم رکھی جائیں۔ حق داروں کو ان کے حقوق پورے پورے ملیں اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے طریقوں اور سنتوں کو جاری کیا جائے۔ یہ وہ خیر ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس کو کبھی موت نہیں آئے گی۔ حاکم کا ظلم رعیت کو تباہ کر دیتا ہے۔ کامیابی یہ ہے کہ دن اور رات کا کوئی حصہ کبھی ایسا نہ گذرے جس میں زبان اللہ کے ذکر سے تر نہ ہو۔ اللہ تعالےٰ کے یہاں سب سے محبوب چیز اصلاح ہے اور سب سے زیادہ مبغوض بات یہ ہے کہ انسان فساد پھیلائے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قیامت کے روز قریب تر اور محبوب تر امام عادل ہوگا اور سب سے زیادہ قابل نفرت اور سب سے زیادہ مبغوض امام ظالم ہوگا۔

حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جب زخمی ہوکر زندگی سے مایوس ہو گئے تو آپ نے ہونے والے خلیفہ کے لیئے چند وصیتیں تحریر کرائی تھیں۔ ان میں یہ وصیت بھی تھی۔

جن سے (جن غیر مسلموں) معاہدہ ہوا ہے وہ اللہ اور اس کے رسول کی پناہ میں ہیں۔ اس پناہ میں رخنہ نہ ڈالا جائے۔ جو معاہدہ ہوا ہے پوری احتیاط سے اس پر عمل کیا جائے۔ ان پر کوئی حملہ کرے تو اس کا دفاع ہمارا فرض ہے اور خود ان کو ان کی طاقت اور برداشت سے زیادہ کوئی تکلیف نہ دی جائے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک صاحب کو محصول وصول کرنے کے لیئے مقرر کر دیا تو اس کو ہدایت فرمائی کہ محصول کے سلسلہ میں سردی یا گرمی کا لباس اور ان کی گذر کا جو غلہ ہے اُسے نہ فروخت کیا جائے۔ کھیتی کے لیے بھی مویشی کی ضرورت ہے وہ نہ فروخت کرنا۔ مار پیٹ یا کھڑا کرنے کی سزا نہ دینا۔ خانگی ضرورت کا سامان نہ فروخت کرنا۔ کیونکہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ ضروریات سے جو فاضل ہو اس کو

وصول کریں۔

یہ صاحب جن کو مقرر کیا تھا انہوں نے عرض کیا کہ حضرت میں نرمی برتوں گا تو جیسے جا رہا ہوں ویسے ہی واپس آجاؤں گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ یہ صاحب گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہدایات کی پابندی کی مگر جیسے گئے تھے ویسے ہی واپس آگئے۔

جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خلیفہ بنائے گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا تھا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ اپنے پیشرو بزرگ (حضرت صدیق اکبر رض) اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا تقرب حاصل کریں تو آپ کا کرتا پیوند لگا ہونا چاہیئے، تہ بند اونچا رہے، چپل اور موزوں میں گٹھی لگی ہو، دنیا کی آرزو نہ ہو اور پیٹ بھر کر کھانا نہ کھائیں۔

عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ خلیفہ بنائے گئے تو راتوں کو رویا کرتے تھے کہ دور دراز گوشوں میں خدا کی مخلوق پھیلی ہوئی ہے جس کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور مجھے ان کی حالت کی خبر نہیں۔ خدا کو کیا جواب دوں گا۔

جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ تخت خلافت پر جلوہ افروز تھے تو فرمایا کہ میرے پاس صرف خمس آتا ہے اور اس میں سے میرے لیے کوئی چیز حلال نہیں۔ مسلمان ہی اس کے مالک ہیں اور مجھ کو چھوڑ کر وہ اس مال کو مستحق لوگوں میں تقسیم کرتے ہیں اور میں بیت المال سے ایک پیسہ بھی نہیں لیتا اور نہ اسے میں اپنے اوپر خرچ کرتا ہوں۔ میں کھانا بھی اپنے ہی پیسے سے کھاتا ہوں۔

(بالاختصار یہ ہونا چاہیئے مسلمان بادشاہ کا کردار)

کتبہ (م، امروی)

(مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی)